سفیر اختر

قانون بابت توہین بانیانِ مذاہب میں اوّلین ترمیم یعنی دفعہ ۲۹۵- الف کا تاریخی پس منظر

[قانون توہینِ رسالت (تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۲۹۵) کے حوالے سے ماہنامہ "عالم اسلام اور عیسائیت" کے گزشتہ چند شماروں میں متعدّد مقالات اور خبریں شائع ہو چکی ہیں۔ اس قانون کی ذیلی دفعات "ب" اور "ج" تو پاکستان کی "پارلیمنٹ" کے اضافات ہیں مگر اس قانون کی ذیلی دفعہ "الف" ۱۹۲۷ء میں شامل کی گئی تھی جس کے پس منظر میں مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء-۱۹۳۱ء) کی پُرزور مہم کے اثرات کارفرما تھے۔ دسمبر ۱۹۷۸ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور ہمدرد فاونڈیشن کی مشترکہ کوششوں سے "مولانا محمد علی جوہر صدی کانفرنس" [مہران ہوٹل - کراچی] منعقد ہوئی تھی۔ راقم الحروف نے اس کانفرنس میں "قانون بابت توہینِ بانیانِ مذاہب میں ترمیم: مولانا محمد علی جوہر کی تاریخی کامیابی" کے عنوان سے زیرِ نظر مقالہ پیش کیا تھا جو عنوان کی تبدیلی کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے، قارئین کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگا۔ واضح رہے کہ نوآبادیاتی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی توہین کرنے والے کے لیے شریعتِ اسلامیہ کے مطابق سزا تجویز کرتی، تاہم "گئے گزرے" حالات میں بھی مسلمانانِ برصغیر توہینِ رسالت کے مسئلے پر خاموش نہ رہے تھے اور ایک حد تک اپنی بات منوا کر رہے۔ مدیر]

برصغیر پاک و ہند میں خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں سے ہندو- مسلم اتحاد کی جو فضا قائم ہوئی تھی، سوامی شردھا نند کی برپا کردہ "تحریک شدھی" نے اسے غارت کر دیا۔ اتحاد اور امن و آشتی کی جگہ ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ آتش زنی اور قتل و غارت کی واردات روزمرہ کا معمول تھیں۔ یہ ناخوش گوار حالات آریہ سماجی مبلّغوں کی تقریروں اور ان کی زہر آلود تحریروں سے مزید خراب ہو رہے تھے۔ اس دور کی دل آزار تحریروں میں سے ایک کتاب "رنگیلا رسول" تھی جو ایک آریہ سماجی ناشر راج پال نے لاہور سے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعض پہلوؤں اور دینِ اسلام پر سوقیانہ حملے کیے گئے تھے۔ کتاب پر مصنف کا نام درج نہ تھا۔[1] ناشر نے اپنا نام و پتہ درج

کر کے پریس ایکٹ کا پیٹ بھر دیا تھا۔

کافی دنوں تک یہ کتاب مسلمانوں کے نوٹس میں نہ آئی۔ صوبائی حکومت کی پریس برانچ نے بھی کوئی اقدام نہ کیا۔ آخر اس کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہوئے تو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ صوبائی حکومت نے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳- الف کے تحت دو فرقوں کے درمیان مذہبی منافرت پھیلانے کے الزام میں ناشر راج پال کے خلاف کارروائی کی۔ لاہور کے سٹی مجسٹریٹ فیلبوس کی عدالت میں مقدمہ کی خاصی طویل سماعت کے بعد ملزم کو چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ سیشن کورٹ میں بھی ملزم کو مجرم گردانا گیا، البتہ اس کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ تقریباً تین سال تک جاری رہنے والی اس کارروائی کے بعد ۱۹۲۷ء میں راج پال کی طرف سے نظر ثانی کی درخواست ہائی کورٹ میں پیش کی گئی۔ درخواست کی سماعت کنور دلیپ سنگھ[۲] جج نے کی۔ کنور دلیپ سنگھ نے ۵ مئی ۱۹۲۷ء کو یہ فیصلہ سنایا کہ یہ کتاب دفعہ ۱۵۳- الف یا کسی اور دفعہ کی زد میں نہیں آتی، اس لیے ملزم مذکورہ کو بری کیا جاتا ہے۔

کنور دلیپ سنگھ کے اس فیصلے نے مسلمانوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ کیا واقعی تعزیرات ہند میں کوئی ایسی دفعہ نہ تھی جس کے تحت کروڑوں افراد کی دل آزاری کرنے والے کو سزا دی جا سکتی۔ مسلمانانِ لاہور سراپا احتجاج بن گئے۔ متعدّد جلسے ہوئے، جلوس نکلے، مذمت کی قراردادیں منظور ہوئیں۔ سب سے بڑا اور معرکہ خیز جلسہ درگاہ حضرت شاہ محمد غوث (بیرون دہلی دروازہ) کے قریب منعقد ہوا۔ اس جلسے سے پنجاب کے آتش نوا خطیب مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے خطاب کیا۔ انھوں نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مفتی کفایت اللہ صاحب کو مخاطب کیا۔[۳]

> لو وہ دیکھیے! ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ آپ کے دروازہ پر تشریف لا کر پوچھ رہی ہیں کہ میری ناموس اور عزت کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

یہ جملے ایسے ڈرامائی انداز میں ادا کیے گئے تھے کہ سامعینِ جلسہ کے جذبات بپھر گئے۔ جلسہ برخاست ہوا تو لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے بجائے سول سیکرٹریٹ کی طرف چل پڑے۔ حکومت کے خلاف نعروں سے لاہور کے در و دیوار گونج اٹھے۔ انتظامیہ نے حالات پر قابو پانے کے لیے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ جلوس منتشر کر دیا گیا اور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری، غازی عبدالرحمن امرتسری اور شیخ حسام الدین ایک ایک سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔

مسلم اخبارات نے دلیپ سنگھ کے فیصلے پر سخت تنقید کی۔ لاہور سے مسلمانوں کا ایک ہی انگریزی اخبار "مسلم آؤٹ لک" چھپتا تھا۔ اس نے اپنے اداریوں میں کھل کر یہ لکھا کہ جج نے قانون کی غلط تشریح کی ہے۔ اس پر اخبار کے پرنٹر پبلشر مولوی نورالحق اور ان کے ایک عزیز (ڈمی ایڈیٹر) دلاور شاہ بخاری پر توہینِ عدالت کا مقدمہ دائر ہوا اور دونوں حضرات کو دو دو ماہ قید اور ایک ایک ہزار روپے

جرمانے کی سزا ہوئی۔

عوامی سطح پر اس ردّعمل کے پہلو بہ پہلو لاہور کے بااثر مسلمانوں کا ایک وفد سر محمد شفیع کی قیادت میں گورنر سر میلکم ہیلی سے ملا اور اسے بگڑتی ہوئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ گورنر نے وفد کی گزارشات سن کر وعدہ کیا کہ وہ مزید چھان بین کریں گے اور اگر واقعی قانون میں کوئی سقم معلوم ہوا تو اسے دور کرانے کی کوشش کریں گے۔ لاہور کے آریہ سماجی رہنماؤں کو گورنر کی یہ زبانی ہمدردی پسند نہ آئی۔ انہوں نے گورنر کے رویّے کے خلاف وائسرائے کو اس مضمون کا احتجاجی تار بھیجا کہ مسلمانوں کے ایک وفد نے گورنر کے سامنے عدالت عالیہ کے فیصلے پر نکتہ چینی کی اور گورنر نے اس وفد کے نقطۂ نظر سے ہمدردی ظاہر کی ہے۔

"مسلم آؤٹ لک" نے مسلمانوں کو نعرہ دیا تھا "دلیپ سنگھ مستعفی ہوجاؤ" اور یہ نعرہ زبان زدعام و خاص تھا۔ توہینِ عدالت کے جرم میں مسلمان زنداں کے ویرانے آباد کر رہے تھے اور جوش بڑھتا جارہا تھا۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر جو بقول سیّد سلیمان ندوی "سچے مسلمان غم خوار تھے۔ ان کے دل میں اسلام کا حقیقی سوز تھا اور رسول رحمت ﷺ کے ساتھ سچا عشق تھا۔"[۴] انہوں نے ۲۷ جون ۱۹۲۷ء کے "ہمدرد" (دہلی) میں کنور دلیپ سنگھ کے فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔[۵]

> جو فیصلہ کنور دلیپ سنگھ نے لکھا ہے اور جسے میں نے بار بار پڑھا--- اس میں مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے ان کا تعصب مذہبی ظاہر ہوتا یا ان کی بد دیانتی مترشح ہوتی۔

مولانا جوہر کا تجزیہ یہ تھا کہ[۶]

> قاضی کے متعلق کوئی بات بھی ایسی مجھے معلوم نہیں جس بناء پر میں اس سے استعفاء طلب کروں، بلکہ اس کا فیصلہ پڑھنے کے بعد اور تعزیرات ہند کے باب ہشتم در بارہ جرائم خلاف امنِ عامہ کی دفعہ ۱۵۳- الف اور باب پانزدہم در بارہ جرائم متعلق مذہب کی تمام دفعات ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷ اور ۲۹۸ کا بار بار اور بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے خود بہت سخت شبہ ہوتا ہے کہ قصور قاضی کا نہیں ہے بلکہ قانون کا ہے۔

مزید لکھتے ہیں۔[۷]

> "میں صاف لکھنا چاہتا ہوں کہ غالباً وہ [کنور دلیپ سنگھ] پہلے جج ہیں جنھوں نے ہم پر یہ احسان کیا ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی بھونڈے طریقہ پر کیوں نہ کیا ہو کہ ہم پر ظاہر کر دیا کہ تعزیرات ہند میں ایک دفعہ بھی ایسی نہیں جس کی رو سے

۱۔ توہینِ بانی اسلام

۲۔ توہینِ اسلام
۳۔ بانیِ اسلام کے خلاف نفرت پھیلانا
۴۔ اسلام کے خلاف نفرت پھیلانا
۵۔ مسلمانوں کی دل آزاری اور
۶۔ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کے دلوں میں حقارت پیدا کرنا۔ ان چھ سنگین ترین جرائم میں سے ایک بھی جرم ہو۔

ہیجان انگیز فضا میں مولانا محمد علی کی یہ آواز جوشیلے رہنماؤں کو پسند نہ آئی۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ اپنے آکسفورڈ کے رفیق کنور دلیپ سنگھ کی جانب داری کر رہے ہیں۔ مولانا کے ایک دیرینہ دوست اور قوم کے مخلص خدمت گار میر غلام بھیک نیرنگ نے انہیں ایک تند و تیز خط لکھا جس میں ان کی روش پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا تھا۔ اس مکتوب کا ایک حصہ یہ تھا۔[۸]

> خدا کے واسطے اب مقدمہ راج پال کی بحث کو اور ایسے مضمون کو اس بحث سے لفظاً یا معناً، ظاہراً یا باطناً، صراحتہً یا اشارۃً یا کنایتہً یا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق قریب یا بعید، حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی، اصلی یا مصنوعی رکھتا ہو بند کر دیجیے۔ آپ کے تمام راسخ العقیدہ نیازمند پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے تھک گئے کہ مسٹر دلیپ سنگھ نے بد دیانتی نہیں کی۔

مولانا نے اپنے ان "راسخ العقیدت نیازمند" کو جو اپنے جذبۂ اسلام اور ہیجان خیز ماحول سے متاثر ہو کر برہم تھے۔ جواب میں لکھا۔[۹]

> نوازش نامہ ابھی ملا۔ ابتدائی فقرہ پڑھا --- اس ابتدائی فقرہ کی ابتداء پر بھی نظر پڑی اور خدا کا واسطہ نظر آیا۔ اس نے مجبور کر دیا کہ جب تک آپ کی اور پنجاب کی اصلاح نہ ہو جائے، لکھے جاؤں۔

مولانا محمد علی نے لکھنے کے ساتھ ملک بھر کا دورہ کیا۔ پبلک جلسوں سے خطاب کیا اور رہنماؤں کو دلائل و براہین سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں لکھنو میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کی صدارت کے لیے مولانا محمد علی کو بطور خاص مدعو کیا گیا، وہاں جلسہ میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے رہنما اپنے روایتی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر یکجا تھے۔ نقیب اہل سنت "النجم" کے مدیر مولانا عبدالشکور فاروقی اور شیعہ کانفرنس کے سیکرٹری ایک ہی سٹیج پر مولانا محمد علی کے پہلو بہ پہلو نظر آ رہے تھے۔ عوام کے ساتھ ساتھ راجہ صاحب محمود آباد، ٹھاکر نواب علی اور دوسرے تعلقداران اودھ بھی حاضرین جلسہ میں شامل تھے۔

مولانا محمد علی نے صدارتی تقریر میں قانون میں ترمیم کرانے پر زور دیا۔ حاضرین اچھا اثر لے کر

اٹھے۔ مغرب کی نماز کے بعد دوسری نشست میں دیگر مقررین کو اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ مولانا ظفر الملک علوی نے ایسی پُرجوش اور ہنگامہ خیز تقریر کی کہ پنڈال فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہجوم بے قابو ہو کر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ اس عالم میں مولانا محمد علی نے تقریر کی جوان کی "صحیح اور تاریخی رہنمائی کی ایک مثال تھی۔"[10] انہوں نے کہا۔"

> ایسی کتابیں اور مضامین یقیناً ہر مسلمان کا خون کھولا دینے کے لیے کافی ہیں۔ جتنا بھی جوش و خروش آپ میں پیدا ہو سب بجا ہے۔ لیکن اصل کوشش فتنہ کے سرچشمہ کو بند کرنے کی ہونی چاہیے نہ کہ فلاں جج کو ہٹا دینے کی۔ قصور قاضی کا نہیں، قصور خود قانون کا ہے۔ میں کوئی وکیل نہیں، بیرسٹر نہیں۔ قانون میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ بار بار ملزم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو ہو کر سیکھا ہے۔ تو مجھ عامی کا پر زور مشورہ یہی ہے کہ آئندہ سدّباب فتنہ کے لیے قانون ہی کو بدلوایے اور تعزیرات ہند میں ایک مستقل دفعہ بڑھوا کر توہین بانیانِ مذاہب کو جُرم قرار دیجیے۔ اب تک یہ کوئی مستقل جُرم ہی آپ کے ملکی قانون میں نہیں۔

مولانا محمد علی نے خود ہی ترمیم کا مسوّدہ تیار کیا[12] جو ان ہی الفاظ اور جملوں پر مشتمل تھا جو تعزیرات ہند میں استعمال ہوئے ہیں۔[13] انہوں نے مسودہ وائسرائے کو بھیجا اور اس کے نام خط میں لکھا۔[14]

> ہز ایکسلنسی کی گورنمنٹ کی توجہ کے لیے میں یہ عرض کروں گا کہ وہ سرکاری مسوّدہ قانون کی حیثیت سے اس کو پیش کرائیں۔

روزنامہ "ہمدرد" کے اداریوں اور مولانا محمد علی کی زبانی تقریروں سے حکومتِ ہند نے اس "ترمیم" کی اہمیت تسلیم کرلی۔ چنانچہ دفعہ ۲۹۵ میں ترمیمی بل (دفعہ ۲۹۵- الف) حکومتِ ہند کے ہوم ممبر[15] نے ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں ۵ ستمبر ۱۹۲۷ء کو پیش کیا۔

ہوم ممبر نے اس بل کو سترہ ارکان پر مشتمل مجلس منتخبہ (سیلیکٹ کمیٹی) کے سپرد کرنے کی تجویز پیش کی جو سات روز کے اندر اپنی رپورٹ ایوان میں پیش کرے۔ ہوم ممبر نے مسوّدہ کے اغراض و مقاصد پر طویل تقریر کی۔ انہوں نے مجموعہ تعزیراتِ ہند میں موجود دفعات کو توہین مذہب کے سلسلے میں ناکافی قرار دیا اور تجویز کیا کہ ملک کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر یہ ترمیمی بل فوراً منظور کرایا جائے۔

اس مسوّدہ پر ارکان اسمبلی میں سے مشرقی پنجاب کے مسلمان رکن جناب عبدالحئی نے حکومت کو مبارک باد پیش کی۔ بمبئی کے جناب ڈی- وی- بیلوی نے مزید یہ ترمیم پیش کی کہ بل کو مجلس منتخبہ کے سپرد کرنے کے بجائے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا جائے۔ جناب بیلوی کی اس ترمیم پر ارکان اسمبلی نے بحث و تمحیص کی۔ اسمبلی کی کارروائی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف

جملہ مسلمان ارکان بل کو جلد از جلد قانون کی شکل دینا پسند کرتے تھے تو دوسری طرف ہندو ارکان کی ایک خاصی تعداد تاخیری حربے استعمال کرنا چاہتی تھی۔

بحث و تمحیص کے بعد ایوان سے رائے لی گئی جس نے جناب بیلوی کی ترمیم مسترد کر دی اور بل کا مسوّدہ مجلس منتخبہ کے سپرد کر دیا گیا۔

مجلسِ منتخبہ کی رپورٹ پر اسمبلی نے ۱۶ ستمبر سے ۱۹ ستمبر تک غور کیا۔ جناب بیلوی نے دوبارہ یہ رائے دی کہ مجلس کی رپورٹ ۱۵ جنوری ۱۹۲۸ء تک رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے شائع کر دی جائے۔ رپورٹ پر دلچسپ بحث ہوئی۔ بعض ہندو ارکان نے اس بل کا مذاق اڑانے کی کوشش کی اور ترمیم پیش کی کہ یہ بل صرف مسلمانوں کے پیغمبر سے مخصوص ہونا چاہیے۔

مسلمان ارکان میں سے یو۔ پی کے تصدق احمد خان شروانی کا لقطہ نظر تعجب انگیز تھا۔ وہ ذاتی طور پر اس قانون کو غیر ضروری قرار دیتے تھے مگر جس حلقے کی نمائندگی کرتے تھے، اس کے سات شہروں میں سے چار نے بل کے حق میں قراردادیں منظور کی تھیں۔ اس لیے وہ بھی بل کی حمایت کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔

تین دن کی طویل بحث کے بعد مسودہ قانون رائے شماری کے لیے ایوان میں پیش کیا گیا۔ ۲۶ ووٹوں کی مخالفت اور ۶۱ ووٹوں کی موافقت سے مسوّدہ قانون منظور کیا گیا اور ۱۹ ستمبر کو کونسل آف سٹیٹ کو بھیج دیا گیا۔ ان ۲۶ مخالف ارکان میں سے کوئی مسلمان رکن نہیں تھا۔

۲۱ ستمبر ۱۹۲۷ء کو کونسل آف سٹیٹ کے سامنے مسوّدہ قانون پیش ہوا۔ کونسل میں بھی وہی رجحان تھا کہ ہندو ارکان کی معتدبہ تعداد مسوّدے کی مخالفت کر رہی تھی اور مختلف ترامیم کے ذریعہ اس کے دائرہ اثر کو محدود کرنا چاہتی تھی۔ بحث کے بعد مسوّدے پر رائے شماری ہوئی۔ اور کثرت رائے سے منظور ہوا۔[۱۷]

ان تمام مراحل سے گزر کر وہ "مسودہ قانون" جو مولانا محمد علی جوہر کی غور و فکر کا نتیجہ تھا اور قانوناً حکومتِ ہند کے ہوم ممبر نے پیش کیا تھا، دفعہ ۲۹۵- الف کی صورت میں مجموعہ تعزیراتِ ہند اور بعد میں مجموعہ تعزیراتِ پاکستان شامل ہوا۔

حواشی

۱۔ کتاب کا مصنف کون تھا؟ اس بارے میں دو نام لیے جاتے رہے ہیں۔ ایک نام ڈی - اے - وی کالج کے پروفیسر چمپتی ایم - اے کا ہے۔ اور دوسرا نام پرتاب (لاہور) کے مدیر مہاشہ کرشن کا، جن کے راج پال کے ساتھ دوستانہ اور کاروباری تعلقات تھے۔ غالب قیاس پروفیسر چمپتی کے متعلق ہے۔

میاں محمد ابوالفتح نے چموپتی لال ایم-اے کو فرضی مصنف قرار دیا ہے۔ جو درست نہیں [غازی علم الدین شہید، لاہور: مکتبہ میری لائبریری (۱۹۷۲ء)، ص ۲۲]
۲۔ کنور دلیپ سنگھ ریاست کپور تھلہ کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد اپنا آبائی سکھ مذہب ترک کر کے عیسائی ہو گئے تھے، اور کنور دلیپ سنگھ پیدائشی طور پر عیسائی تھے۔ [رئیس احمد جعفری، افادات محمد علی، حیدآباد: ادارہ ادبیات اردو (۱۹۴۵ء)، ص ۱۷۳]
۳۔ میاں محمد ابوالفتح غازی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۹
۴۔ سید سلیمان ندوی، یادرفتگاں، کراچی: مکتبہ الشرق (۱۹۵۵)، ص ۲۱۰
۵۔ رئیس احمد جعفری، حوالہ مذکورہ، ص ۱۶۰
۶۔ ایضاً، ص ۱۶۲
۷۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۸۔ ایضاً، ص ۲۰۴ نیز رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، لاہور: کتاب منزل (طبع دوم: ۱۹۵۰ء)، ص ۴۸۵
۹۔ رئیس احمد جعفری، افادات محمد علی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۰۴
۱۰۔ عبدالماجد دریا بادی، محمد علی - ذاتی ڈائری، اعظم گڑھ: دارالمصنفین (۱۹۵۶)، حصہ اول، ص ۴۱۹
۱۱۔ ایضاً، ص ۴۱۸
۱۲۔ مولانا محمد علی کا مسوّدہ یہ تھا۔

"جو کوئی شخص کسی کا دل دکھانے، کسی شخص کے مذہب کی توہین کرنے کی نیت سے یا اس امر کے احتمال کے علم سے کہ اس کے ذریعہ سے کسی شخص کا دل دُکھے گا یا کسی شخص کے مذہب کی توہین ہوگی۔ ایسی باتوں کے ذریعہ سے جو تلفظ سے ادا کی جائیں یا لکھی جائیں یا اشاروں کے ذریعہ سے یا نقوش مرئیہ کے ذریعہ سے یا اور اسی طرح کسی نبی یا ولی یا اور شخص کی جسے لوگوں کا فرقہ اسی طرح مقدّس سمجھتا ہو توہین کرے یا اس کی نسبت ایسا اتہام لگائے یا مشتہر کرے جس سے اور لوگوں میں اس کی ملکات کی خفت ہو تو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہو سکتی ہے، یا جرمانہ کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔ (رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، حوالہ مذکورہ، ص ۴۸۷ - ۴۸۸)

۱۳۔ رئیس احمد جعفری، افادات محمد علی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۲۵
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۱۵۔ "سیرت محمد علی" میں ہے کہ یہ قانون اسمبلی میں نواب ذوالفقار علی خان نے پیش کیا تھا۔ (ص ۴۸۹) یہ روایت درست نہیں۔ نواب ذوالفقار علی خان قائداعظم محمد علی جناح کی تجویز سے مجلس منتخبہ کے رکن لیے گئے تھے۔

۱۶۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ تیسری قانون ساز اسمبلی (۱۹۲۷ء) کے پہلے اجلاس کی روداد، جلد چہارم و جلد پنجم، شملہ: گورنمنٹ آف انڈیا پریس (جنوری ۱۹۲۸ء)

۱۷۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ دوسری کونسل آف سٹیٹ (۱۹۲۷ء) کے تیسرے اجلاس کی روداد، جلد دوم، شملہ: گورنمنٹ آف انڈیا پریس (نومبر ۱۹۲۷ء)